# الرسالہ
# Al-Risala

June 2001 • No. 295 • Rs. 10

اندیشوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات
یہ ہے کہ بیشتر اندیشے کبھی واقعہ نہیں بنتے۔

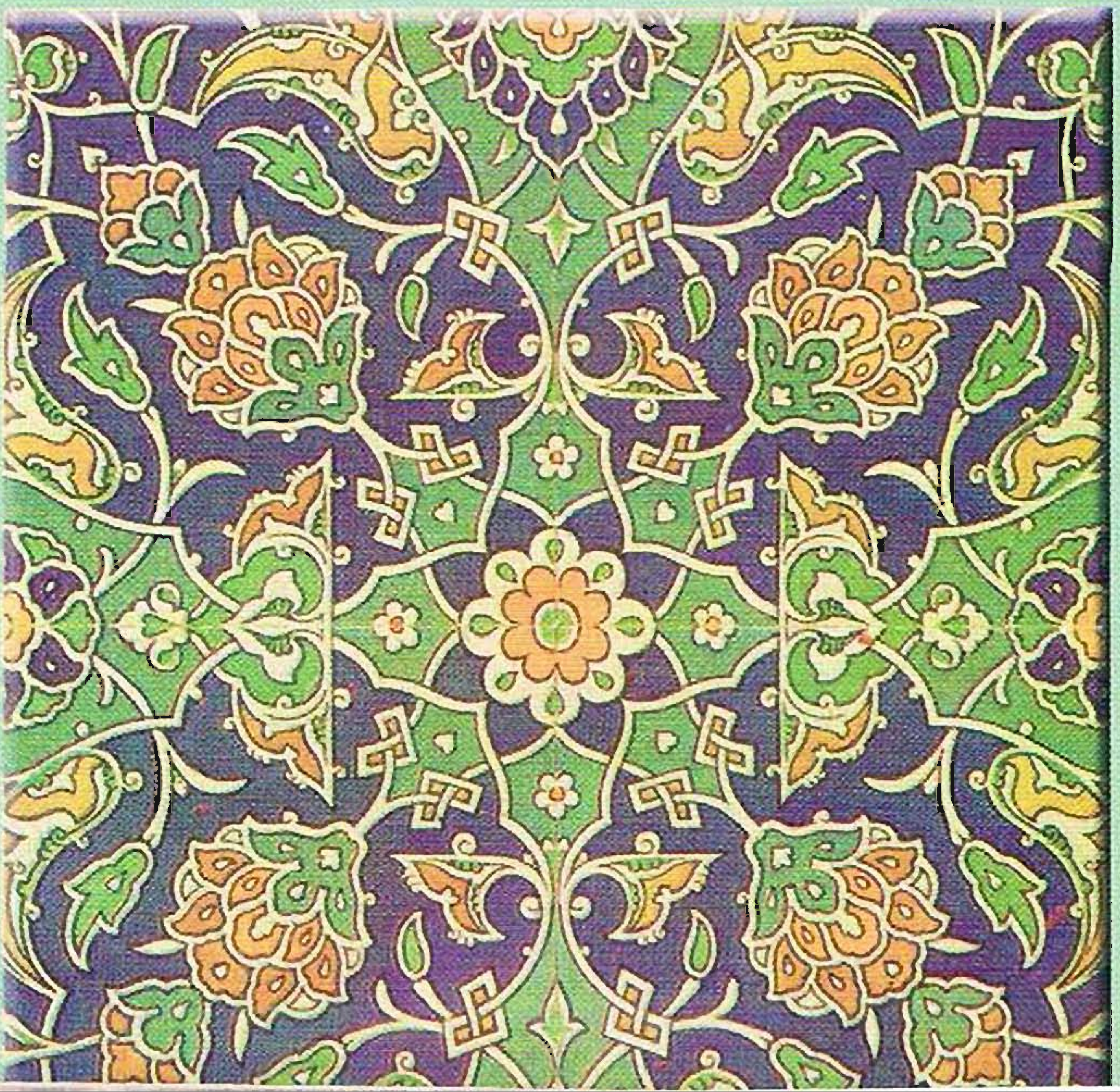

# زندہ قلب

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه انه قال: اُطلُب قَلْبَكَ فی ثَلاثَة مَواطِنَ. عند سماع القرآن وفی مجالس الذّکرِ و فی اوقات الخلوة. فَان لَم تَجدهُ فی هٰذه المَواطِنَ فَسلِ الله اَن یَمُنَّ علیك بقلبِ فِانَهُ لاَ قَلْبَ لَكْ.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تم تین مواقع پر اپنے دل کو تلاش کرو۔ قرآن سننے کے وقت اور خدا کے ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے وقتوں میں۔ اگر ان مواقع پر تم اپنے دل کو نہ پاؤ تو اللہ سے درخواست کرو کہ وہ تم کو ایک دل دے دے۔ کیوں کہ تمہارے پاس دل موجود نہیں۔

دل آدمی کے جسم میں کیفیت کا سرچشمہ ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بتاتا ہے کہ ایک مومن سے مختلف احوال میں جو قلبی کیفیات مطلوب ہیں، وہ کیا ہیں۔ مثلاً قرآن سننے کے وقت، خدا کی یاد کی مجلسوں میں اور اسی طرح تنہائی کے لمحات میں، یہ تین مواقع وہ ہیں جب کہ دینی اور ربانی کیفیات خصوصی طور پر آدمی کے اندر جاگتی ہیں۔ ان مواقع پر غافل آدمی بھی چونک پڑتا ہے۔ سویا ہوا آدمی بھی جاگ اٹھتا ہے۔ وہ فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آدمی کا دل اگر زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہو گا کہ جب اس کے سامنے قرآن پڑھا جائے گا تو اس سے اس کو ربانی غذا ملنے لگے گی۔ جب اس کو خدا کی یاد دلائی جائے گی تو اپنے خالق و مالک کے بارہ میں اس کے اندرونی احساسات جاگ اٹھیں گے۔ جب وہ تنہائی میں ہو گا تو اس کے اندر احتساب خویش کی کیفیت ابھر آئے گی۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پائے گا۔

اگر کسی آدمی کا حال یہ ہو گا کہ یہ خصوصی مواقع بھی اس کی روح میں ہلچل پیدا نہ کریں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر کی کھیتی ویران ہو گئی ہے۔ اس کے اندر فطرت ربانی کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو اس حال میں پائے، اس کو چاہئے کہ وہ اللہ سے اپنے لئے ایک زندہ قلب اور کیفیت سے بھری ہوئی روح کا طالب بنے۔ کیوں کہ اس کے بغیر انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے بغیر کسی انسان پر سعادتوں کا دروازہ کھلنے والا نہیں۔

# خیر امت

"تم خیر امت ہو" اور "ہم خیر امت ہیں" ان دونوں فقروں میں بظاہر معمولی لفظی فرق ہے۔ مگر پہلا فقرہ قرآن میں موجود ہے، جب کہ دوسرا فقرہ قرآن یا حدیث میں موجود نہیں۔ قرآن و سنت اور آثار صحابہ کا پورا ذخیرہ دوسرے فقرے سے یکسر طور پر خالی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا کہ "تم خیر امت ہو" مگر کسی بھی صحابی کی زبان سے کبھی یہ الفاظ نہیں نکلے کہ "ہم خیر امت ہیں"۔

یہ فرق بتاتا ہے کہ دونوں جملوں میں اگر چہ بظاہر صرف معمولی لفظی فرق ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک مکمل طور پر صحیح ہے اور دوسرا مکمل طور پر غلط۔ اگر دونوں جملوں میں یہ فرق نہ ہوتا تو جس طرح پہلا فقرہ قرآن میں موجود ہے، اسی طرح دوسرا جملہ بھی اصحاب رسول کی زبان سے ضرور ادا کیا جاتا۔

اصل یہ ہے کہ "خیر امت" اللہ تعالیٰ کا ایک فیصلہ ہے نہ کہ مسلمانوں کا گروہی لقب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے جب اپنے سالہا سال کے عمل کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ فی الواقع ان اوصاف کے حامل ہیں جو اللہ کی نظر میں اوصاف خیر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے بطور اظہار واقعہ یہ ارشاد فرمایا کہ اے اصحاب رسول اب تم خیر امت کے درجہ کو پہنچ چکے ہو۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس سے کنتم خیر امة کی یہ تفسیر منقول ہے کہ اس سے مراد اصحاب رسول ہیں (بقیہ لوگ اپنے عمل کے اعتبار سے عند اللہ اس میں شامل قرار پائیں گے)۔

اس معاملہ کو ایک اور مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن میں صحابہ کرام کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا (رضی الله عنهم) مگر کسی بھی صحابی کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ اس نے اپنی زبان سے یہ کہا ہو کہ ہم وہ لوگ ہیں جن سے اللہ راضی ہے۔ یہ اللہ کے فیصلہ کا معاملہ ہے نہ کہ صحابہ کے اپنے دعویٰ کا معاملہ۔ اسی طرح خیر امت بھی خدا کا ایک فیصلہ ہے، اس کو اپنی طرف سے بطور دعویٰ بیان کرنا درست نہیں۔

# ایک اور عمل

علیہ بن زید ایک غریب صحابی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے تیاری کے لئے کہا۔ علیہ بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ میرے لئے سواری کا انتظام کر دیں تاکہ میں بھی اس مہم میں شرکت کر سکوں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس مزید سواری یا مال نہیں ہے جس سے میں تمہاری مدد کروں۔

علیہ بن زید اپنے گھر کی طرف لوٹے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کا دل اس احساس سے بے قرار تھا کہ کاش میرے پاس سواری اور زادراہ ہوتا تو میں بھی اس اسلامی عمل میں شرکت کرتا۔ اس دن وہ ساری رات نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ اس وقت ان کی زبان سے یہ دعا نکلی: اے اللہ تو نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ مگر تو نے مجھے وہ سامان نہیں دیا جس کے ذریعہ میں جہاد میں شرکت کر سکوں۔ میں صدقہ جہاد پر قادر نہیں۔ اب جس مسلمان نے بھی مال یا جسم یا آبرو کے مقابلہ میں مجھ پر کوئی زیادتی کی ہو تو میں اس کو اسی مسلمان کے اوپر صدقہ کرتا ہوں۔

ایک اور حدیث (التفسیر المظہری ۴/۲۸۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صحابی کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور بقیہ صحابہ کے ساتھ شریک جہاد نہ ہونے کے باوجود وہ جہاد کے انعام کے مستحق قرار پائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن اگر معذوری کے سبب سے عملاً کسی کارِ خیر میں شریک نہ ہو سکے تو اس کے بعد بھی اس کے لیے شرکت کا موقع ہے اور وہ یہ کہ اپنی روح کی تڑپ اور اپنے دل کی کیفیات کے ساتھ وہ اس میں شریک ہو جائے، وہ دعاؤں اور آنسوؤں کے ساتھ ان کا ہم سفر بن جائے جن کا ہم سفر وہ سواریوں کی صورت میں نہ ہو سکا تھا۔ جو صاحب ایمان ایسا کر سکے اس کے لیے خدا کے یہاں وہی ثواب ہے جو عملی طور پر شریک ہونے والوں کا ہے۔

خارجی عمل جس طرح اہم ہے اسی طرح داخلی عمل بھی اہم ہے۔ بلکہ بعض اوقات داخلی عمل خارجی عمل سے بھی زیادہ عظیم ہو جاتا ہے۔

# تلاوت قرآن

قرآن کی تلاوت وہ چیز ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ایمان والے وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں (الانفال ۲) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے (المائدہ ۸۳۔۸۴)

قرآن براہ راست خدا کا کلام ہے۔ اس میں خداوندی جلال کی گرج ہے۔ اس میں عبدیت کے احساس کو جگانے والی بجلیاں ہیں۔ اس میں وہ نور ربانی ہے جو کسی کے اندر اترے تو اس کے پورے داخلی وجود کو روشن کردے۔ اس میں وہ شعلۂ حق ہے جو کسی قلب پر اترے تو وہ اس کو کوہ طور کی طرح ریزہ ریزہ کردے۔ ایسے کلام کی تلاوت سادہ طور پر تکرار الفاظ کا نام نہیں ہوتی۔ وہ دل و دماغ میں آگ لگانے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا بار بار پڑھنا شخصیت انسانی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

قرآن کی تلاوت سادہ طور پر ایک کتاب کی تلاوت نہیں ہے۔ یہ کلام الٰہی کا مطالعہ ہے۔ یہ گویا بالواسطہ انداز میں خدا سے ہم کلام ہونا ہے۔ ایسی حالت میں تلاوت قرآن کے دوران اس کے مطابق کیفیات کا ظہور ہونا چاہیے۔ اگر اس غیر معمولی کلام سے مطابقت رکھنے والی کیفیات آدمی کے اندر پیدا نہ ہوں تو سمجھا جائے گا کہ وہ غفلت میں مبتلا ہے، اس نے زندہ شعور کے ساتھ قرآن کو نہیں پڑھا۔

قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا ہونا چاہیے کہ آدمی کے اوپر خدا کی ہیبت طاری ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگے۔ قرآن کا پڑھنا اس کو خدا سے ملانے والا بن جائے۔ قرآن کو پڑھنا اس کے لیے خدا سے زندہ تعارف کے ہم معنی ہو۔ قرآن میں وہ ایک طرف اپنی عبدیت کو پالے اور دوسری طرف خدا کی معبودیت اور اس کے جلال کو۔

# یک طرفہ سلوک

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اجتماعی معاملات میں یکطرفہ حسن سلوک کا انداز اختیار کیا جائے۔ اگر کوئی شخص اشتعال انگیز باتیں کرے۔ یا وہ برائی کے ساتھ پیش آئے تب بھی اس کے مقابلہ میں منفی رد عمل کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، بلکہ برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے۔ برائی کے جواب میں بُرائی کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

اس قسم کا اعلیٰ سلوک اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کا سلوک کرے تو قرآن کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی دوست قرابت والا (حم السجدہ ۳۴)۔ اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ دو فرد یا گروہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، ایک کی اشتعال انگیز بات دوسرے کو بھڑکا دیتی ہے۔ ایک کی طرف سے برائی کا سلوک دوسرے کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ وقتی طور پر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے دونوں ایک دوسرے کے حریف اور دشمن ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر دو مختلف اور متضاد صلاحیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں 'نفس امارہ' کہا گیا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کے لیے قرآن میں 'نفس لوامہ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ دونوں صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ البتہ وہ اس وقت جاگ پڑتی ہیں جب کہ انھیں باہر سے کوئی ٹھیس پہنچائی جائے۔

آپ کا اختلاف کسی سے ہو جائے یا کسی وجہ سے ایک شخص آپ کو اپنا دشمن دکھائی دینے لگے تو ظاہر حالات کی بنیاد پر فیصلہ نہ کیجئے۔ ایسا جب بھی ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی وجہ سے اس آدمی کا نفس امارہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اب اگر آپ اس کے جواب میں نرمی کا انداز اختیار کر کے اس کے بھڑکے ہوئے نفس امارہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس کے دشمنانہ سلوک سے بُرا اثر نہ لیتے ہوئے اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو اس کے نتیجہ میں اس کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ اگر آپ ایسا کریں تو وہی معجزہ پیش آئے گا جو قرآن میں مذکور ہے۔ یعنی وہ شخص جو آپ کا دشمن دکھائی دے رہا تھا وہ آپ کا دوست بن جائے گا۔

# عالی ظرفی

دور عباسی کا ایک واقعہ تاریخ کی بعض کتابوں میں ان الفاظ میں آیا ہے:

**خطب الخليفة العباسی المنصور يوماً في جماعة من الاعراب بالشام، فقال: ايها الناس ينبغي ان تحمدوا الله على ما وهبكم فيّ. فاني منذ وليتكم ابعد الله عنكم الطاعون الذی كان يفتك بكم. فقال له احد المستمعين ان الله اكرم من ان يجمع علينا في وقت واحد الطاعون والمنصور۔**

(خلیفہ منصور عباسی نے ایک روز شام کے اعراب کی ایک جماعت کے سامنے تقریر کی۔ اس نے کہا کہ اے لوگو، تم کو چاہئے کہ تم میرے جیسے خلیفہ کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کیوں کہ جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں اللہ نے تم سے طاعون کو دور کر دیا ہے۔ اس کے بعد سننے والوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ ایک وقت میں ہمارے اوپر طاعون اور منصور دونوں کو جمع کر دے)۔

اعرابی کا یہ جملہ سخت توہین آمیز تھا۔ عام طریقہ کے مطابق چاہئے تھا کہ خلیفہ منصور عباسی اس کو سن کر بھڑک اٹھے اور مذکورہ شخص کے قتل کا حکم دے دے۔ مگر خلیفہ منصور نہایت بلند حوصلہ آدمی تھا۔ اس نے اس کی قدر کی اور حکم دیا کہ اس شخص کو خزانۂ خاص سے انعام دیا جائے اور اس کو عزت کے ساتھ اس کے گھر پہنچایا جائے۔

پست اور کمینہ قسم کے لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کہنے والے نے ان کی موافقت میں بات کہی ہے یا ان کی مخالفت میں۔ وہ موافق کو نوازتے ہیں اور مخالف کے دشمن بن جاتے ہیں۔ مگر بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگ موافقت اور مخالفت سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔ وہ اصل بات کو دیکھتے ہیں نہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

اسی کا نام عالی ظرفی ہے۔ یہ عالی ظرفی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے افراد کو اپنے گرد اکٹھا کر سکے۔ اس کے برعکس جس آدمی کے اندر عالی ظرفی کی یہ صفت نہ پائی جائے۔ اس کو اس کی قیمت اس شکل میں دینی پڑے گی کہ بے صلاحیت افراد کے سوا اس کو کسی اور کی ہم نشینی حاصل نہ ہو۔